م۔حسن لطیفی ☆

پچھتاؤ گے تم کھو کے، لطیفی نہ ملے گا

جب میری عمر تین، ساڑھے تین سال تھی تو وہ انتقال کر چکے تھے۔جس وقت میں الہ آباد (یو پی،انڈیا) کی سرخ اینٹوں والی صاف ستھری گلیوں میں کھیلا کرتی تھی، وہ میانی صاحب قبرستان (لاہور) میں آسودۂ خاک تھے، جب میں شہرِ کراچی کے ایک گرلز کالج میں زیرِ تعلیم تھی، جنون کی حد تک مطالعہ کا شوق تھا اور اپنی ڈائری میں اپنے پسندیدہ اشعار لکھا کرتی تھی تو ان کا یہ شعر بھی میری ڈائری میں لکھا گیا تھا ؎

وابستہ تیری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ مجھ کو فراموش کر دیا

شاعر کی جگہ قوسین میں لکھا تھا (نامعلوم)۔بیت بازیوں میں یہ شعر بھی خوب استعمال ہوتا۔

۱۹۸۳ء میں جب میری شادی ہوئی تو سجاد اور سسرال کے بعض بزرگوں سے لطیفی صاحب کے نام،ان کے حالات اور شاعری سے آگاہی ہوئی۔تب یہ معلوم ہوا کہ لطیفی صاحب میرے سسر اور ساس (جو آپس میں خالہ زاد تھے) کے والدین کے کزن تھے۔رشتہ تو مجھے کبھی یاد نہ ہوا

☆ تاریخ پیدائش: ۱۱ردسمبر ۱۹۰۵ء۔   لدھیانہ،انڈیا۔
تاریخ وفات: ۲۳رمئی ۱۹۵۹ء۔   تدفین:لاہور۔

البتہ ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ جب ہم اسلام آباد گئے تو سجاد نے مجھے م۔حسن لطیفی کی بڑی بیٹی عذرا سے ملوایا، وہ ایک طرحدار خاتون تھیں، ڈاکٹر تھیں اور میجر جنرل محمد ظہور ملک کی اہلیہ! اُس وقت پچپن چھپن کے پیٹے میں رہی ہوں گی۔مجھ سے بڑی شفقت سے ملیں اور بہت دیر تک لطیفی صاحب کی باتیں ہوتی رہیں۔ان کی شاعری....ان کی خطابت....ان کا پریس...ان کی لائبریری کی باتیں اور یادیں شیئر کرتی رہیں۔اس کے بعد میری ان سے دوسری کوئی ملاقات نہیں ہوئی لیکن یہ ضرور ہوا کہ م۔حسن لطیفی سے میری اجنبیت ختم ہوگئی۔

لطیفی کا نام محمد حسن تھا لیکن دنیائے شعر وادب میں م۔حسن لطیفی کے نام سے مشہور ہوئے، والد — میاں محمد شاہ — لدھیانہ کے رئیس تھے۔انہوں نے پہلی جنگ عظیم سے قبل اپنی ملٹری کنٹریکٹرز کی فرم قائم کی تھی اور ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستوں کے ساتھ ان کی تجارت تھی۔بعد میں ان کی تجارت بیرون ہندوستان بھی جاری رہی۔دولت کی ریل پیل تھی اور م۔حسن لطیفی ان کے اکلوتے بیٹے تھے لیکن تقسیمِ ہند کے بعد جب وہ خالی ہاتھ پاکستان چلے آئے تو سب کچھ پیچھے رہ گیا۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔راجپوت، پنجابی تھے۔بی۔اے پنجاب سے، ایم۔اے (انگریزی) علی گڑھ یونی ورسٹی سے اور جرنلزم میں ڈپلوما ۱۹۳۱ء میں آکسفورڈ سے کیا۔غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے۔مادری زبان (پنجابی) کے علاوہ جرمنی اور اطالوی زبانوں سے واقف تھے۔اردو، انگریزی، فارسی اور فرانسیسی زبانوں میں ان کی تحریریں موجود ہیں۔وہ ''رج'' کے شاعر تھے۔کسی بھی موضوع پر، کسی بھی وقت، کہیں بھی نظم یا رباعی یا غزل کہنے پر قادر تھے۔ان کا بیشتر شعری کلام ''لطیفیات'' کے عنوان سے تین جلدوں میں ہے۔

لطیفیات (۱) ۱۹۲۸ء

لطیفیات (۲) ۱۹۳۵ء

لطیفیات (۳) ۱۹۸۹ء

ہفت آویزہ ۱۹۳۷ء یہ سات طویل نظموں کا مجموعہ ہے۔اس کے علاوہ کئی طویل نظمیں انہوں نے اپنے شاطو پریس سے کتابچوں کی شکل میں شائع کیں۔اُن کے نثری کاوشوں میں ''عظمت آدم''، ''دخترانِ ہند''، ''نظریہ مہدی'' اور *The Legend of Heer Ranjha* شامل ہیں۔

شاطو پریس، لدھیانہ میں ان کی کوٹھی شاطو کے پائیں باغ میں قائم لائبریری کے عقب میں قائم تھا، وہیں ان کی شاندار لائبریری تھی، وہ جب آکسفورڈ سے واپس آئے تو بیس ہزار مالیت کی کتابیں بھی ساتھ لائے ـــ یہ وہ زمانہ تھا جب فورڈ کار پانچ سو روپے میں ملتی تھی ـــ ایسا لگتا تھا کہ پریس انہوں نے ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں لگایا تھا کیونکہ پھر اسی پریس سے انہوں نے ہفت روزہ ''مطالعہ'' شائع کرنا شروع کیا، یہ Solo Journalism کی پہلی مثال ہے۔ یہ ہفت روزہ دو زبانوں (اردو۔ انگریزی) میں نکلتا تھا جس میں لکھنے والے وہ خود تھے۔ تین سال تک (۱۹۳۲-۱۹۳۵ء) شاطو پریس سے یہ ہفت روزہ چھپتا رہا۔ اسی شاطو پریس سے ان کے ستر سے زائد انگریزی مقالات بھی شائع ہوئے۔ یہ سب پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوتے تھے۔

آکسفورڈ سے واپسی کے اگلے برس، ۱۱ر نومبر ۱۹۳۲ء کو ان کی اپنی چچازاد سے شادی ہوئی، تین بچے ہوئے۔ اکلوتا بیٹا میاں محمد پروین لطیفی (۱۹۳۴-۱۹۵۱ء) محض سترہ سال کی عمر میں چل بسا، اس صدمے نے انہیں اندر اندر کھانا شروع کر دیا۔ ان کی دو بیٹیاں عذرا اور صوفیہ ہیں۔ آخرالذکر پی۔ ٹی وی میں پروڈیوسر تھیں۔

م۔حسن لطیفی سیاحت کے شوقین تھے۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، ایران اور سعودی عرب کے سفر کیے۔ انہی میں حج کے دو اسفار (۱۹۳۱-۱۹۳۶ء) بھی شامل ہیں۔ وسیع المطالعہ تھے، ان کے مطالعہ کی ہمہ گیری کا اندازہ ان کے کلام اور نثری تحریروں سے ہوتا ہے۔ جہاں ہر مصرعے اور ہر جملے میں پورا ایک تاریخی دور کروٹیں لیتا ہے۔ عالمی ادب پر بھی گہری نظر تھی، ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ہم جیسوں کو فرہنگ کی ضرورت پڑتی ہے۔

برطانوی ہند کے زمانے میں جیل یاترا بھی کی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران ایران پر رضا شاہ کبیر (محمد رضا پہلوی کے والد) کی حکومت تھی۔ اتحادی طاقتیں (برطانیہ، فرانس اور روس) یہ چاہتی تھیں کہ اس جنگ میں ایران ان کا حلیف بن کر شامل ہو جب کہ رضا شاہ کبیر، جرمنی سے قریبی تعلقات رکھنے کی وجہ سے جنگ میں اتحادیوں کی طرف سے شرکت سے گریزاں تھے۔ اس پر اواخر اگست ۱۹۴۱ء میں برطانوی اور روسی فوجیں ایران میں داخل ہوگئیں، رضا شاہ کبیر کو معزول کر دیا گیا۔ ان کی جگہ ان کے بائیس تیئس سالہ بیٹے محمد رضا پہلوی کے سر پر تاج رکھ کر ایران کا بادشاہ بنا دیا گیا تاکہ اس کم عمر اور ناتجربہ کار حکمران سے اپنی مرضی کے فیصلے کرائے جاسکیں۔ رضا شاہ کبیر کو ایک بحری جہاز میں بیٹھا کر ہمیشہ کے لیے ایران سے رخصت

کردیا گیا، انہوں نے اپنی زندگی کے باقی ماہ وسال جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں گزارے۔ اُس زمانے میں جوہانسبرگ، برطانیہ کی کالونی تھا۔

عالمی استعماری طاقتوں کا ایسا جبر کسی بھی حساس شخص کو دکھی اور بے چین کرسکتا ہے۔م۔ حسن لطیفی نے بھی اس ظلم کے خلاف ۲۶ راگست کو اپنی کوٹھی 'شاطو' کے سامنے ایک جلسہ کیا جس میں ایک اندازے کے مطابق آٹھ، نو ہزار افراد نے شرکت کی۔ اس جلسۂ عام میں لطیفی نے ڈھائی گھنٹے تک برطانیہ کے خلاف تقریر کی، نتیجتاً گرفتار ہوئے، پہلے وہ لدھیانہ جیل میں رکھے گئے پھر پنڈی جیل منتقل کردیے گئے۔ سو روپے جرمانہ اور تین ماہ کی نظر بندی بھگت کر رہا ہوئے۔ لدھیانہ جیل میں انہوں نے نظم ''ایراں! تیرے لیے'' کہی۔ جس کا مطلع ہے ۔

ڈالا گیا میں قید میں ایراں تیرے لیے
مجھ کو قبول، زحمتِ زنداں تیرے لیے

انتیس اشعار پر مبنی اسی نظم کا ایک اور شعر ہے۔

تیور ہیں اس گھڑی ،ترے وحشی کے دیدنی
کرتا ہوں تار تار گریباں تیرے لیے

(لطیفیات، حصہ سوئم، ص ۸۰)

بنیادی طور پر وہ ظلم کے نظام کے خلاف تھے، انہوں نے مسئلہ کشمیر، جوناگڑھ پر ہندوؤں کے قبضے، سقوطِ حیدرآباد اور مسئلہ فلسطین پر اپنی نظموں میں بے چینی اور دکھ کا اظہار کیا۔ ۱۹۳۸ء میں جب فلسطین میں یہودیوں کے قافلے کے قافلے چلے آرہے تھے اور فلسطینی عرب، مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ،ایک طرف برطانوی انتدابی حکومت کے خلاف احتجاج کررہے تھے اور دوسری طرف قابض یہودیوں سے نبردآزما تھے۔ لطیفی نے اپنی نظم ''فلسطین'' لکھی ۔

خوں ریزئ اعراب سے رنگیں ہے فلسطیں
دورانِ خزاں میں بھی بہاریں ہے فلسطیں
خونِ شہداء سے ہے زمین احمر و شاداب
یعنی سبد تازۂ گل چیں ہے فلسطیں

یافا کے سرِباب سے تا بیتِ مقدس
اک محشر نظّارۂ تکفیں ہے فلسطیں

(لطیفیات، حصہ سوئم، ص ۶۳)

جب اقوام متحدہ نے تقسیمِ فلسطین کا منصوبہ منظور کیا تو عالمِ اسلام کے قلب میں گویا خنجر اتار دیا گیا، اس موقع پر لطیفی نے نظم ''یروشلم'' کہی ۔

تڑپ اٹھے جس سے ہند و مصر و عراق و ایران و شام و لبناں
خراش ہائے افق میں جھلمل یروشلم ہے وہ تازہ عنواں

....

سرِ خبر سے ہے آج تک ماجرائے رود فرات شاہد
ہمیشہ سینچی گئی شہیدوں کے خون ہی سے خنک بہاراں

مفتیٔ اعظم فلسطین امین الحسینی اور ٹیپو سلطان جیسے سرفروش ان کی شاعری میں رنگ بھرتے رہے۔

قیام پاکستان کے ایک ماہ بعد ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ انہوں نے لدھیانہ میں اپنی جائیداد، دوکانیں، باغات، مکانات اور شاطو (کوٹھی) کے عوض کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ دربدری کی کیفیت رہی اس پر مستزاد جوان بیٹے کی رحلت (۱۹۵۱ء) نے تو گویا ان کی زندگی کا شیرازہ ہی بکھیر دیا۔ ہجرت کے بعد کی شاعری میں ایک حُزن، اداسی اور تنہائی کا سیل رواں نظر آتا ہے۔ دماغ متاثر ہوا تو گھر سے بھی نکل گئے۔ کبھی کہیں تو کبھی کہیں۔

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

بالآخر ۲۳ رمئی ۱۹۵۹ء کو دل میں کتنے ہی سوالات کے ادھورے جوابات لیے راہی ملک عدم ہوئے اور لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں آسودہ خاک ہوئے۔

میں ان سے کبھی نہیں ملی، لیکن انہیں اپنے دل سے قریب ہی پایا۔

(تحریر: ۹ راگست ۲۰۲۴ء)